اس فصل کو پاٹا اور اسلامی عقائد کو تعلیم یافتہ عجمیوں کے لئے قابلِ فہم اور قابلِ قبول بنا دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑے مخلص مسلمان تھے۔

اعتزال کی تحریک پہلی صدی ہجری کے آخر میں متعصب فرقہ خوارج کے متشدد عقائد اور فرقہ مرجیہ کے اخلاقی رویّہ کا جواب تھی۔ یہی وجہ ہے، کہ ان کا پہلا مذہبی عقیدہ المنزلة بین المنزلتین کے نام سے مشہور ہے۔ انھوں نے ایک طرف خوارج کے اس عقیدہ کا ابطال کیا کہ ایمان اور عمل کے مابین کوئی فرق نہیں اور عمل کے بغیر ایمان قائم نہیں رہ سکتا۔ دوسری طرف مرجیہ کے برعکس جو عمل کو ایمان کے لئے ضروری نہیں قرار دیتے تھے، انھوں نے عمل کی اہمیت اور انسان کی شخصی ذمہ داری پر بھی زور دیا۔ اس سلسلہ میں انھیں قرآن حکیم کی اُن آیات سے بطور خاص استدلال کرنا پڑا جن میں انسانی اختیار اور ذمہ داری کا ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ ان کے مخالف مرجیہ جبر کے قائل تھے۔ اس طرح ابتداءً معتزلہ عقلیت نہیں بلکہ ٹھوس مذہبیت کے حامی تھے، اور انکی تعلیمات قرآن پر مبنی تھیں، بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ عراق کے سنیوں میں وہی سب سے زیادہ زیادہ راسخ العقیدہ فکر کے حامل تھے زمانہ مابعد میں ان کے مخالفین کے لئے یہ امر پریشان کن ثابت ہؤا کہ حضرت حسن بصری اور امام ابوحنیفہؒ جیسے اصحاب کے عقائد میں بھی اعتزال کا شائبہ پایا جاتا ہے۔

دُوسری صدی ہجری میں ہمیں معتزلہ کے حالات کی صرف ایک جھلک سی ملتی ہے لیکن اس میں بھی ان کی حیثیت بہت نمایاں ہے یعنی وہ ایک بڑی عظیم الشان تبلیغی جدوجہد کے لیڈر کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ یہ تبلیغ ان ملحدانہ افکار کے مقابلہ پر شروع کی گئی تھی جو مانوی فرقے نے پھیلا رکھے تھے۔ ثنویت اور مانویت کے اثرات نہ صرف عراق کی پرانی عرب آبادی میں شائع وذائع تھے بلکہ اس صوبہ کی آرمائی (ARMAEAN) آبادی بھی ان سے متاثر تھی۔ غالباً اسی تصادم کے باعث جو ثنویت کے ساتھ واقع ہؤا معتزلہ کو یونانی منطق اور فلسفہ کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ اس کے بعد ہی یونانی زبان سے عربی میں علوم و فنون کے ترجمہ کا آغاز ہؤا اور تیسری صدی ہجری کے آغاز میں اس کا پھیلاؤ بہت بڑھ گیا۔ یہی زمانہ اعتزال کے غلبہ کا تھا جس سے تمام مؤرخ بخوبی واقف ہیں، بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے، کہ یونانی افکار کی اشاعت کے ساتھ ہی اعتزال کا رنگ بدل گیا۔ لیکن یہ تبدیلی صرف ظاہری تھی۔ اعتزال اب بھی اصلاً اخلاقی اور عملی اعتبار سے ایک زاہد و متقی جماعت کی تحریک تھی جو جبری عقائد کے ساتھ تصادم کے باعث اپنے عقیدوں میں اور زیادہ راسخ اور بے لچک ہوگئی، کیونکہ بنوامیہ کے زوال کے ساتھ ہی جبر و اختیار کی نزاع کا سیاسی پہلو کمزور ہوگیا اور اس مسئلہ نے ایک دینیاتی بحث کی صُورت اختیار کر لی جس میں اکثریت جبر کی طرف مائل تھی اور معتزلہ اختیار کے حامی تھے۔

جہاں تک اعتزال کے فلسفیانہ مکاتیبِ خیال کا تعلق ہے ان میں سے تقریباً سب کے سب ایک استاد کے تلامذہ پر مشتمل تھے، اس طرح ہر ایک بڑی شخصیت کے گرد اس کے پیرووں کا ایک حلقہ بن جاتا تھا۔ لیکن ان مختلف گروہوں کی کوئی ایک عمومی رائے نہ تھی، یونانی منطق کی مدد سے انھوں نے اپنے موقف کی حمایت میں کئی ایک جدید دینیاتی نظامات ترتیب دیئے اور جیسا جیسا

وقت گزرتا گیا وہ مابعد الطبیعیات کی سرحدمیں داخل ہوتے گئے، ان کی علمی کاوشوں نے راسخ العقیدہ علماء کو بھی کسی حد تک اپنا ہمنوا بنا لیا۔ لیکن جب معتزلہ کی انتہا پسند جماعتوں نے اسلامی عقائد کو یونانی تصورات کے سانچے میں ڈھالنا شروع کیا اور قرآن کریم کے بجائے انھوں نے اپنے دینی عقائد یونانی فلسفہ سے اخذ کرنے شروع کئے تو آخر الذکر طبقہ نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔

بجا طور پر کہا جا سکتا ہے، کہ راسخ العقیدہ مسلمانوں کو معتزلہ کے مقابلہ میں جو کامیابی حاصل ہوئی اس کا جبر و اختیار اور خلق قرآن کے مسائل سے کوئی تعلق نہ تھا، بلکہ معتزلہ نے اپنے تین بنیادی عقیدوں میں قدرے غلو سے کام لیا اور یہی ان کی شکست کا سبب بن گیا ان میں سے پہلا عقیدہ الوعد والوعید کا ہے جو ان کی عملی زندگی کا اصل اصول اور انسان کی شخصی ذمہ داری کے تصور کی بنیاد تھا۔ لیکن ان کی متشددانہ عدم رواداری اور جبر و زور کے استعمال کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے خلاف عوام الناس میں ایک زبردست ردعمل پیدا ہو گیا۔ پھر عدل اور توحید کے دوسرے اور تیسرے عقیدہ کی توجیہ کے سلسلہ میں بھی ان کے مخالفین کو بہت کچھ مواد حاصل ہو گیا جس کو انھوں نے معتزلہ کے خلاف کامیابی سے استعمال کیا۔ ذات الٰہی کو تشبیہہ اور تجسم کی آلائش سے پاک رکھنے کی فکر میں معتزلہ نے نفی صفات میں اتنا غلو کیا کہ ان کے تصور الوہیت میں کوئی اثباتی پہلو باقی نہیں رہا۔ قرآن کریم کے پیش کردہ تصور الوہیت میں، جو تشخص نمایاں تھا وہ رفتہ رفتہ اس حد تک زائل ہو گیا کہ معتزلہ کے اور عام مسلمانوں کے خدا کے درمیان ادنیٰ ترین نسبت بھی نہیں رہی، یونانی فلسفہ کے بحر ذخار میں پھنس کر ان کی فکر بے قید اور ان کے تصورات کا پھیلاؤ بے پناہ ہو گیا، تیز جرمن فلسفیوں سے بھی بڑھ کر ان کا سر رشتہ فکر عام زندگی کے ٹھوس حقائق اور اس کے احتمالات سے بالکل بے تعلق ہو گیا۔ حقیقت اصلیہ کی تلاش میں انھوں نے منطق کے قیاسات و کلیات کا استعمال کر کے زندگی سے اپنا رشتہ بالکل منقطع کر لیا۔

اس طرح اعتزال کی تحریک بالآخر ناکام رہی۔ عملی زندگی کے دائرہ میں معتزلہ نے مذہبی تشدد سے کام لیا اور اسلامی رواداری کے اصول سے ہٹ گئے، یہاں تک کہ انھوں نے اپنے مخالفین کی ایذا رسانی میں بھی کوئی پس و پیش نہ کیا۔ دینیاتی عقائد کے دائرہ میں انھوں نے ایک خلا پیدا کر دیا اور انسانی عقل کو کتاب الٰہی کا مدمقابل بنا دیا۔ راسخ العقیدہ فکر والوں نے بجا طور سے ان کے دعاوی کی تردید کی۔ معتزلہ کی ایک اعتدال پسند شاخ جو فلسفہ اور مذہب کی ترکیب و امتزاج کی حامی تھی، خالص عقلیت کے حامیوں سے کٹ کر حامیان سنت سے مل گئی اور یونانی منطق کے طرق استدلال سے قرآن و حدیث کی مدافعت کرنے میں اس نے ایک نیا علم کلام پیدا کیا جس نے معتزلہ کو انھیں کے ہتھیاروں سے شکست دی۔

اس فتح کا سہرا امام ابوالحسن الاشعری اور ماتریدی سمرقندی کے سر ہے جنھوں نے تیسری صدی ہجری میں اشعری علم کلام پیدا کیا۔ جبر و اختیار کی تطبیق کو مکمل کرنے کی کوشش میں الاشعری نے تقدیر الٰہی اور عدل الٰہی کے متضاد تصورات کو کسب کے نظریہ سے ملا دیا جس کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ افعال انسانی خدا کے ارادہ سے وجود میں آئے ہیں۔ لیکن ان کی

ذمہ داری انسان ہی کے سر ہے کیونکہ انسان انھیں کسب کرتا ہے۔ صفات الٰہی کے مسئلہ میں اشعری نے انکی ابدیت کا اثبات کیا لیکن معتزلہ کے اس خیال کو قائم رکھا کہ خدا کی ذات تشبیہ اور تجسّم سے بری ہے۔ اعتزال کے عقائد کی سختی کو نرم کرنے کے لئے اشاعرہ نے شفاعت کے تصوّر پر زور دیا اور معتزلہ کے برخلاف جو اس بات کے قائل تھے کہ خدا وہی کچھ کرتا ہے جو اس کے بندوں کے لئے اصلح اور سود مند ہو، اشاعرہ نے دعویٰ کیا کہ خدا اپنی جزا و سزا میں کسی اصول و قانون کا پابند نہیں بلکہ جس کو چاہتا ہے، نوازتا ہے اور جس کو چاہتا ہے مطعون و مردود قرار دیتا ہے یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ علّت و معلول کا لزوم سنّت الٰہی کے مفہوم کا منطقی نتیجہ ہے، انھوں نے جوہر فرد کا ایک پیچیدہ نظریہ پیش کرکے علّت و معلول کے لزوم کو بالکل ختم کر دیا۔

غالباً اسلام کے حق میں یہ بہتر ہوا کہ معتزلہ کی عقلیت اپنا کام ختم کرکے میدان ہار گئی، اگر اسے کامیابی ہوتی تو وہ اسلامی تحریکات کبھی سرسبز نہ ہوتیں جن کے ذریعہ بعد کی صدیوں میں اسلام کو از سرِ نو زندگی ملی۔ معتزلہ کی عقلیت کا اسلام کے نظامِ فکر میں جذب ہونا دشوار تھا۔ اگر اعتزال کی تحریک کامیاب ہوتی، تو اسلامی ثقافت انتشار اور برہمی کا شکار ہو جاتی اور اسلام کو اس سے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچتا۔ لیکن اعتزال اچانک ناپید نہیں ہوا اور اس کے پیرو جو بہت عرصہ تک بصرہ اور مشرقی ایران میں موجود رہے، اپنے زہد و اتقا کے اعتبار سے ممتاز تھے نیز معتزلہ کے بعض عقائد شیعہ عقائد میں آمیز ہو کر آج بھی زندہ ہیں۔

(ماخوذ از ایچ۔ اے۔ آر گب)

عقائد و اعمال مصنفہ محمد مظہر الدین صدیقی ایم۔ اے: اس کتاب میں صدیقی صاحب نے پہلے اس امر سے بحث کی ہے، کہ عقیدہ کی کیا تعریف ہے، اسکی ضرورت کیوں پیش آتی ہے، اور عقیدہ کے بغیر اجتماعی زندگی کا قیام ممکن ہے، یا نہیں، اس کے بعد مصنف نے مذہبی عقیدہ کی تشریح و توجیہہ کی ہے۔ پھر توحید کے تصور سے بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اسلام سے قبل کے توحیدی مذاہب مثلاً: عیسائیت اور یہودیت نے زندگی، اور کائنات کے بارے میں کیا عقیدہ قائم کیا تھا، آخر میں اسلام کے توحیدی تصور پر روشنی ڈالتے ہوئے مصنف نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اسلامی عقیدہ توحید عیسائی اور یہودی عقائد کی تکمیل ہے جس نے یہودیت اور عیسائیت کے بہترین عناصر کو ایک وحدت میں جمع کر دیا۔ اسکے بعد مصنف نے اسلام میں عبادت کے تصور سے بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اسلام نے دین و دنیا کی تفریق کو کس طرح مٹایا اور عبادت کو کتنا وسیع کر دیا۔ آخری حصہ میں صدیقی صاحب نے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ اسلامی عقیدہ توحید کی رُو سے ہمیں زندگی کے مختلف دائروں خاص تعلیم، معاشی زندگی اور سیاست میں کس قسم کا عملی رویہ اختیار کرنا چاہیئے۔ **قیمت** بارہ آنے۔

ملنے کا پتہ

سکریٹری: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور۔ پاکستان

محمد جعفر شاہ پھلواروی

مذہب اور ترنم

بائیبل مقدس کے متعلق یہ دعویٰ بہت مشکل ہے کہ یہ الف سے ی تک بالکل صحیح ہے اور اس میں کسی قسم کا کوئی رد و بدل نہیں ہوا ہے ہمارے پاس ایسے بیشمار شواہد موجود ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بائیبل میں بہت سی باتیں الحاق کی گئی ہیں۔ کچھ باتیں عقل کے خلاف ہیں کچھ تاریخی حقائق کی نقیض ہیں اور کچھ ایسی بھی ہیں جن کو صحیح تسلیم کرنے کے بعد انبیا علیہم السلام ایک معمولی انسان کے مقام سے بھی گر جاتے ہیں ——— اس کے باوجود یہ دعویٰ بھی درست نہیں تسلیم کیا جا سکتا کہ بائیبل شروع سے آخر تک سب کی سب غلط، محرّف اور نادرست ہے اور اس میں کوئی صحیح بات یا وحی کا کوئی حصہ موجود نہیں۔ اگر فی الواقع بائیبل کو از اوّل تا آخر محرّف و بے معنی اور خود ساختہ تسلیم کیا جائے تو ان تمام قرآنی آیات کی توجیہہ دشوار تر ہو جاتی ہے جن میں توریت و انجیل پر ایمان لانے کو جزو ایمان قرار دیا گیا ہے یا جن میں قرآن کو بائیبل کا مصدق بتایا گیا ہے یا جن میں اہل کتاب کو بائیبل کے سانچے میں زندگی ڈھالنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

صحیح بات یہی ہے کہ بائیبل از اوّل تا آخر نہ بالکل غلط ہے اور نہ بالکل صحیح کچھ باتیں غلط ہیں اور کچھ صحیح بھی ہیں۔ اس کے اندر صحیح اور غلط کو ممتاز کرنے کے جہاں متعدد معیار ہو سکتے ہیں وہاں ایک بہت بڑا معیار خود قرآن پاک ہے ——— قرآن اگر کسی پیغمبر کے متعلق ایک بات بیان کرے اور بائیبل یا دنیا کی کوئی کتاب اسکے خلاف کہے تو ہم قرآن ہی کی بات کو صحیح سمجھیں گے۔ ہاں اگر بائیبل کوئی ایسی بات بیان کرے جو قرآنی روح سے متصادم نہ ہوتی ہو (تاریخی اور عقلی حقائق بھی قرآن ہی کی روح ہیں) تو اسے صحیح مان لینے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہیئے۔

ہم اسی زاویہ نظر سے بائیبل کے ایک حصے ——— زبور ——— کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ کتاب حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ واتینا داؤد زبورا۔ اس کے پانچ حصے اور کُل ایک سو پچاس ابواب ہیں اور یہ ساری کتاب نظم میں ہے۔ اسی لئے زبور کو مزامیر داؤد بھی کہتے ہیں ——— مزامیر جمع ہے مُزمور (بضم میم اوّل و فتح واو) اور مزمار (بکسر میم) کی ——— زمر کے معنی ہیں بانسری وغیرہ پر گانا۔ اور مزامیر داؤد کا مطلب اقرب الموارد میں یوں لکھا ہے:

ما کان یترنم بہ من الاناشید والادعیۃ وھوالذی یقال لہ الزبور۔

حضرت داؤدؑ جو اشعار اور دعائیں ترنم سے پڑھا کرتے تھے ان ہی کو مزامیر داؤد اور زبور بھی کہتے ہیں۔

اس مفہوم کیلئے سب سے جامع لفظ "گیت" ہے۔ چنانچہ خود زبور کا ۶۶واں باب یوں شروع ہوتا ہے: "میر مغنی کے لئے گیت یعنی مزمور"۔ اور ۶۷ویں باب کا آغاز یوں ہوتا ہے: "میر مغنی کے لئے تار دار سازوں کے ساتھ مزمور یعنی گیت"۔ گویا مزمور اور گیت ایک ہی چیز ہے لیکن اس لفظ کے متضمنات میں دو اور چیزیں بھی داخل ہیں۔ ایک ترنم اور دوسرے ساز۔ حقیقت یہ ہے کہ مزمور تو ان گانوں کو کہتے ہیں جو ساز پر الاپے جائیں اور مزمار اس ساز کو کہتے ہیں جس کے ساتھ کوئی گانا گایا جائے۔ جمع دونوں کی "مزامیر" ہے۔ گویا مزمور وہ ہے جو

مزمار پر گایا جائے اور مزمار وہ ہے جس پر مزمور گایا جائے۔ اور مزامیر (بصورت جمع) گیت کو بھی کہتے ہیں اور ساز کو بھی۔ دونوں گویا لازم وملزوم ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ترنم سوز و ساز کے اندر ہی داخل ہیں۔

زبور کا انداز یہ ہے کہ تقریباً ہر باب ایک گیت پر مشتمل ہے اور اس کی سُرخی (عنوان) غنائی اشارات پر۔ مثلاً: باب ۴ کا آغاز یوں ہے: "میر مغنی کے لئے تاردار سازوں کے ساتھ داؤد کا مزمور"۔ باب ۵ سے پہلے: "میر مغنی کیلئے بانسلیوں کے ساتھ داؤد کا مزمور"۔ باب ۶ یوں شروع ہوتا ہے: "میر مغنی کیلئے تاردار سازوں کے ساتھ شمینیت کے سُر پر داؤد کا مزمور"۔ باب ۸: "میر مغنی کے لئے گتیت کے سُر پر .... الخ"۔ باب ۹: "موت لبین کے سُر پر .... الخ"۔ باب ۱۶: "داؤد کا مکتام ...."۔ باب ۲۲: "میر مغنی کے لئے ایلت ہشحر کے سُر پر .... الخ"۔ باب ۲۳: "داؤد کا مزمور مشکیل"۔ باب ۴۵: "میر مغنی کیلئے شوشنیم کے سُر پر بنی قورح کا مزمور مشکیل عروسی سرود"۔ باب ۴۶: "میر مغنی کے لئے علاموت کے سُر پر ایک گیت"۔ باب ۵۳: "میر مغنی کے لئے محلت کے سُر پر داؤد کا مشکیل"۔ باب ۵۴: "میر مغنی کے لئے تاردار سازوں کے ساتھ داؤد کا مشکیل"۔ باب ۵۶: "میر مغنی کیلئے یونت الیلم رحوقیم کے سُر پر داؤد کا مزمور۔ مکتام۔ باب ۵۷: "التشخیت کے سُر پر داؤد کا مزمور۔ مکتام"۔ باب ۶۰: "میر مغنی کے لئے داؤد کا مکتام سوسن عیدوت کے سُر پر"۔ باب ۶۲: "میر مغنی کے لئے یدوتون کے طور پر .... الخ"۔ باب ۷۲: "سلیمان کا مزمور"۔ باب ۷۳: "آسف کا مزمور"۔ باب ۹۰: "مردِ خدا موسیٰ کی دُعا"۔ باب ۹۲: "مزمور سبت کے دن کے لئے گیت"۔ باب ۹۵ کی پہلی آیت یوں ہے: "آؤ ہم خداوند کے حضور نغمہ سرائی کریں"۔ باب ۹۶ کی پہلی آیت یوں ہے: "خداوند کے حضور نیا گیت گاؤ"۔ باب ۱۲۰ سے باب ۱۳۴ تک ہر باب کا عنوان یوں ہے: "مصلوت یعنی ہیکل کی زیارت کا گیت" (اس میں بیشتر گیت داؤدؑ کے اور بعض سلیمانؑ کے ہیں)۔ باب ۱۴۴ کی نویں آیت یوں ہے: "اے خدا میں تیرے لئے نیا گیت گاؤں گا۔ دس تاروالی بربط پر میں تیری مدح سرائی کروں گا"۔

ہم نے مختصر طور پر جو فہرست پیش کی ہے ان سے مندرجہ ذیل نتائج واضح طور پر نکلتے ہیں:

(۱) حضرت داؤد کے پاس متعدد مغنی (گانے والے) موجود تھے اور کوئی ایک مغنی ان سب کا افسر تھا جو میر مغنی تھا۔

(۲) عام طور پر بانسری اور عود (بربط) ستار، دف اور جھانجھ بطور ساز استعمال کئے جاتے تھے۔ (اس کا ذکر آگے آتا ہے)۔

(۳) خاص خاص گیتوں کیلئے خاص خاص سُر مقرر تھے۔ مثلاً: شمینیت، گتیت، موت لبین، ہشحر، شوشنیم، علاموت، محلت، یونت الیلم رحوقیم، التشخیت، سوسن عیدوت وغیرہ — مجھے ابھی تک کوئی ماہر بائیبل ایسا نہیں مل سکا جو یہ تمام سُر انکے فرق کے ساتھ سنا سکتا۔

(۴) صرف حضرت داؤدؑ ہی نہیں بلکہ حضرت سلیمانؑ اور انکے وزیر آسف بھی یہ گیت گاتے تھے۔ (۵) قدیم دعائیں (مثلاً حضرت موسیٰؑ کی دعا) بھی بطور گیت کے گائی جاتی تھیں۔ (۶) ان گیتوں کے مضامین میں حمد، دعا، نغمۂ فتح، زیارتِ ہیکل، پیشگوئی وغیرہ سب چیزیں موجود ہیں۔ (۷) خدا کے حضور گیت گانے اور بجانے کا پیغمبر حکم بھی دیتا ہے اور خود بھی اس کا اظہار فخر کے ساتھ کرتا ہے۔

حرفِ آخر: ان سب سے زیادہ دلچسپ وہ حکم یا نصیحت ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام یوں کرتے ہیں:

"نرسنگے کی آواز کے ساتھ اس کی حمد کرو۔ بربط اور ستار پر اس کی حمد کرو۔ دف بجاتے اور ناچتے ہوئے اسکی حمد کرو۔"

تار دار سازوں اور بانسری کے ساتھ اسکی حمد کرو۔ بلند آواز جھانجھ کے ساتھ اسکی حمد کرو۔ زور سے جھنجھناتی جھانجھ کے ساتھ اسکی حمد کرو۔

یہ آیات ۳ تا ۵ ہیں جو زبور کے آخری باب نمبر ۱۵۰ کی آیات ہیں -

مزامیر داؤدؑ : آگے چلنے سے پہلے یہیں ایک روایت سنتے جایئے۔ مسلم اور نسائی میں حضرت ابو موسیٰ اشعری سے روایت ہے کہ ایک دن :

قال لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لو رأیتنی البارحۃ و انا استمع لقراءتک، لقد اعطیت مزمارا من مزامیر آل داؤد، قلتُ واللہ یا رسول اللہ لو علمتُ لحبّرتہ لک تحبیرا -

حضورؐ نے مجھ سے فرمایا کہ رات میں تمہاری تلاوتِ قرآن سن رہا تھا، تمہیں تو لحن داؤدی عطا ہوا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! بخدا اگر مجھے یہ علم ہوتا کہ حضور سن رہے ہیں، تو میں اور عمدگی سے پڑھتا -

یہاں ظاہر ہے کہ "مزمار" سے مراد نہ گیت ہے نہ ساز، بلکہ اس سے مراد تلاوت کا ایسا انداز ہے جس میں موسیقیت کی جھلک ہو، کچھ سُر ہو کچھ لَے ہو۔ اسی کے لئے ایک جامع لفظ "تغنّی" ہے۔ بعض روایات میں تغنّی کا حکم یا ترغیب موجود ہے اور اسی مفہوم کے لئے ایک دوسری روایت ابو داؤد اور نسائی میں حضرت براء سے یوں مروی ہے :

زیّنوا القرآن باصواتکم -　　　　قرآن کو عمدہ آواز سے پڑھا کرو -

غرض قرآن کی تلاوت کا انداز ایسا تو ضرور ہونا چاہیئے جس میں دلکشی ہو، حسنِ صوت ہو اور دوسرے منظوم و منثور کلام سے فرق محسوس ہو۔ لیکن موسیقیت کے سُر تال، طبلے اور معازف و مزامیر (باجوں) سے اسے قطعاً الگ رکھنا چاہیئے ـــــ ہمارے موجودہ دَور کا اندازِ تلاوت اس کی بہت کچھ نمائندگی کرتا ہے۔ آجکل جو لہجے ـــــ مثلاً حسینی، حجازی، پختہ حجازی، بڑی ہنجلوی اور چھوٹی مصری، مایہ، رکبی، عُشّاقی وغیرہ ـــــ رائج ہیں وُہ سب تزیینِ اصوات فی القرآن کی عملی تعبیریں کہی جاسکتی ہیں اگرچہ ان میں تکلفات کو بڑا دخل ہو گیا ہے حضورؐ نے تزیین قرآن کا ذریعہ صرف اصوات (آوازوں) کو بنانے کا حکم دیا ہے۔ طبلے، سارنگی، ہارمونیم، بانسری کے ذریعے اس تزیین میں اضافہ کرنے کا نہ کوئی حکم دیا اور نہ اس پر کبھی عمل ہوا ایسی بھی قرآنی وقار و احترام کو دیکھتے ہوئے کوئی ذوقِ سلیم یہ گوارا نہیں کرسکتا کہ اس میں سوز پیدا کرنے کیلئے سازوں سے مدد لی جائے -

لیکن دُوسری بہت سی چیزیں گائی جاسکتی ہیں خواہ سازوں کے ساتھ ہو یا بغیر ساز کے مثلاً : (۱) بعض ایسی حدیثیں جو ترنم کا مطالبہ کرتی ہیں۔ ان میں چند قسم کی چیزیں آتی ہیں : (الف) بعض مناقب جیسے من کنت مولاہ فعلیؓ مولاہ۔ یہ ترانہ صوفیوں کی محفل سماع میں یوں گایا جاتا ہے : من کنت مولاہ فعلیؓ مولاہ + دِھر توم دِھر توم توم تانا نانا ناری + یلّلی یلّلی یل یلّی + من کنت مولاہ فعلیؓ مولاہ + ـــــ بالکل اسی انداز سے "لو کان نبیٌ بعدی لکان عمرؓ" کو بھی گایا جاسکتا ہے لیکن صوفیوں کو کم از کم قوالی وغیرہ کے موقعے پر نہ حضرت عمرؓ سے کوئی دلچسپی ہوتی ہے نہ کسی پیغمبر سے، نہ خالد بن ولید سے اور نہ ابو حنیفہ سے -

مجھے اس ترانے کی دُھن پوری طرح آتی ہے لیکن کاغذ پر اسے منتقل کرنا مشکل ہے -

(ب) بعض نکاح یا فتح کے شادیانے مثلاً طبرانی کی ایک روایت ہے : عن عائشۃؓ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما فعلت فلانۃ؟ لیتیمۃ کانت عندھا فقلت اھدیتھا الی زوجھا فقال ھل